تجزیہ

یادگار مرثیہ

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

ترتیب
تحقیق و تنقید

ڈاکٹر سید تقی عابدی
(کنیڈا)

خدائے سخن میر انیس

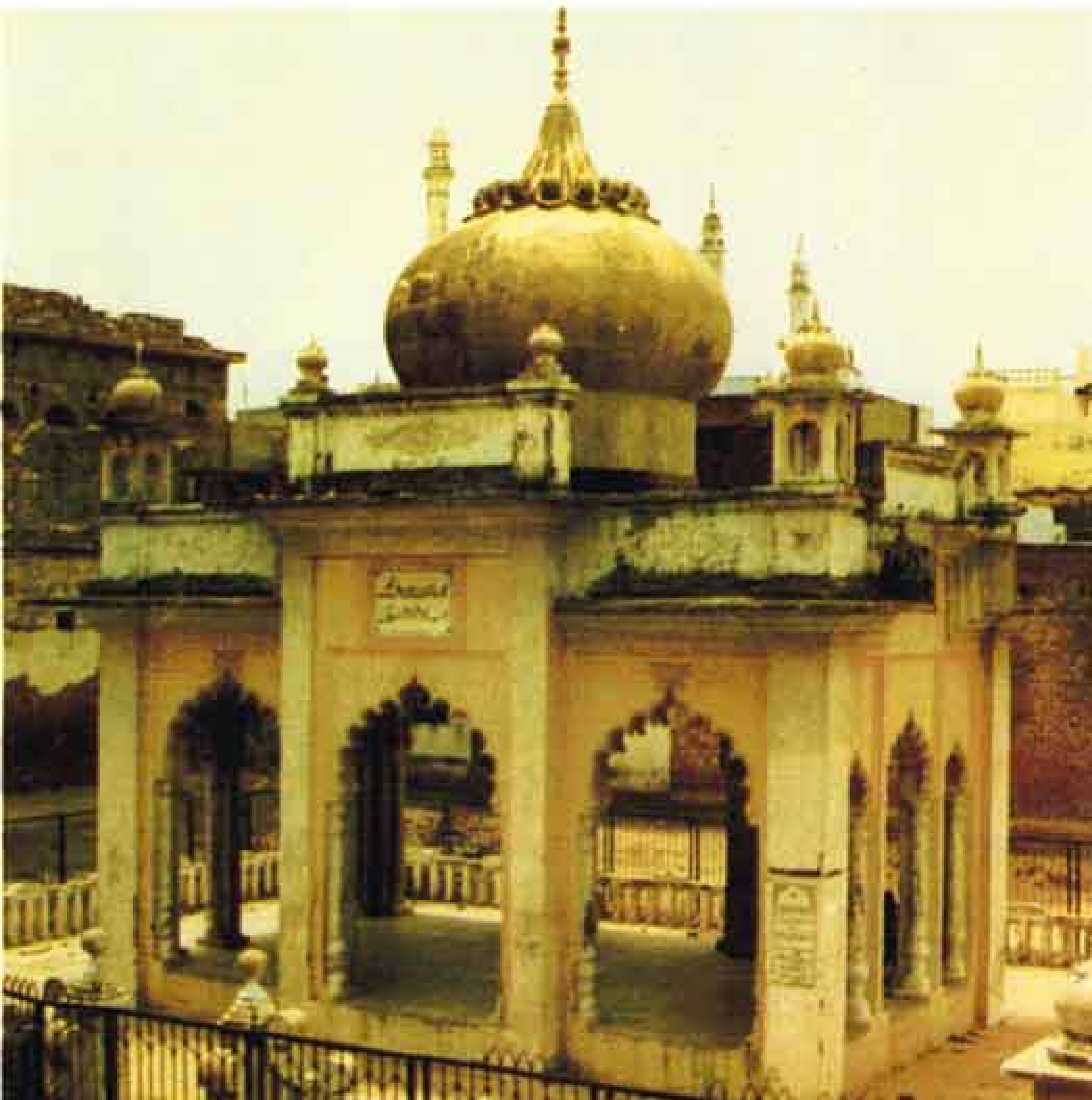

خواب گاہِ میر انیس مرحوم

خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے

شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

(انیسؔ)

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

نام کتاب	:	تجزیہ یادگار مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے"
ترتیب، تحقیق وتنقید	:	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی (ایم۔ڈی)
ناشر	:	ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)
اشاعتِ اوّل	:	2002ء
ڈیزائن	:	اختر رسول
فوٹوگرافی	:	سید علی اصغر شکوہ (لکھنؤ)
کمپوزنگ	:	T.F.C کمپیوٹرس سرینگر (کشمیر)
طباعت	:	پرنس آرٹ پرنٹرس، 2811، دریا گنج، نئی دہلی (انڈیا) فون: 91-11-3266482
قیمت	:	-/750 روپے

نگراں

ڈاکٹر ظفر حیدری کشمیری

Dr. Zafar Hyderi Kashmiri

ملنے کا پتہ:

Dr. Syed Taghi Abedi

1110- Secretariate Rd.

New Market-on

L3X 1M4 CANADA

Tel : 905-868-9578(home)

Tel : 416-495-2701 Ext.= 5233(work)

Fax No: 905-868-9578

e-mail :yaalimadad12@hotmail.com

چوتھا باب

مرثیہ کے منتخب اشعار

بہتر (72) جواہر

اس مرثیہ کے پانچ سو اٹھاسی 588 اشعار سے بہتر منتخب اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جنہیں ہم نے "بہتر جواہر" سے موسوم کیا ہے۔

1۔ جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رُخ بے حجاب نے

2۔ ہم وہ ہیں، غم کریں گے ملک، جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

3۔ رنگیں عبائیں دوش پہ، کمریں کسے ہوئے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

4۔ کانوں کو حسنِ صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

5۔ گویا دہن کتابِ بلاغت کا ایک باب
سوکھی زبانیں شہدِ فصاحت سے کام یاب

6۔ لبوں پہ شاعرانِ عرب تھے مرے ہوئے
پستے لبوں کے وہ جو نمک سے بھرے ہوئے

7۔ باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب
ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابو تراب

8۔ سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

9۔ ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

10۔ پھولوں سے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدگل فروش تھے

11۔ خواہاں تھے زہر گلشنِ زہراؑ جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

12۔ طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر ہونک رہے تھے کچھار میں

13۔ بے چوبۂ سپہر بریں جس کا سائبان
بیت العتیق دیں کا مدینہ جہاں کی جاں

14۔ دیکھا جو نور شمسۂ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی ہے صبح گلِ آفتاب پر

15۔ شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

16۔ جلوہ تھا تا بہ عرش معلّیٰ حسینؑ کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلّیٰ حسین کا

17۔ قرآن کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آگے جیسے ہو، یوں تھے شہہ حجاز

18۔ خم گردنیں تھیں سب کی خضوع وخشوع میں
سجدوں میں چاند تھے، مہ نو تھے رکوع میں

19۔ تھرّائے آسمان، ہلا عرش کبریا
شہپر تھے دونوں ہاتھ پئے طائر دعا

20۔ وہ خاکسار محوِ تضرع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

21۔ پروانے تھے سراج امامت کے نور پر
رو کی سپر، حضورؑ کرامت ظہور پر

22۔ شوکت میں رشک تاج سلیمان تھا خودِ سر
کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر

23۔ بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

24۔ مشک و عبیر و عود اگر ہیں تو ہیچ ہیں
سنبل پہ کیا کھلیں گے یہ گیسو کے پیچ ہیں

25۔ سرکو، ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس

26۔ مہندی تمہارا لال مَلے ہاتھ پاوں میں
لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

27۔ سارا چلن خرام میں کبک دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دلہن کا ہے، چہرہ پری کا ہے

28۔ اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

29۔ مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

30۔ گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

31۔ گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

32۔ گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شررفشاں

33۔ پانی تھا آگ گرمیٔ روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

34۔ بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

35۔ لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

36۔ ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سواران شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

37۔ کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو خوب رو جدا

38- مہتاب سے شعاع جدا، گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا، رگ جاں سے لہو جدا

39- ظاہر نشانِ اسم عزیمت اثر ہوئے
جن پہ علی لکھا تھا وہی پر سپر ہوئے

40- اس آب پر یہ شعلہ فشانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

41- غصہ میں شیر شرزۂ صحرائے کر بلا
چھوڑے تھے گرگ منزل و ماوائے کر بلا

42 وہ شورِ صیحۂ فرس ابلق و سرنگ
وہ لوں وہ آفتاب کی تابندگی وہ جنگ

43- کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

44- بالا قدو کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر

45- دل میں بدی طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

46۔ بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تہ نشیں نہنگ، مگر آب تھے جگر

37۔ دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

48۔ نقشہ کھینچے گا صاف صفِ کار زار کا
پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

49۔ ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑ گڑائے
غصے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کڑ کڑائے

50۔ ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعیں کے پاؤں
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاؤ زمیں کے پاؤں

51۔ بد ہاتھ میں شکست، ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اُڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ، ایک ہاتھ میں

52۔ فیاض، حق شناس اولعزم ذی شعور
خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور

53۔ لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو
پیدا تنوں سے پیرہن یوسفی کی بو

54۔ صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحف ناطق کے نور کی

55۔ حیدر کی فاطمہؑ کی حسینؑ حسنؑ کی بو
پھیلی ہوئی تھی چار طرف پنجتن کی بو

56۔ لٹتا تھا عطر وادیٔ عنبر سرشت میں
گل جھومتے تھے باغ میں، رضواں بہشت میں

57۔ اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگ سخت سے
جس طرح توڑے کوئی پتا درخت سے

58۔ ان کی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتنؑ کی ہے
لو بھائی لو علم یہ عنایت بہن کی ہے

59۔ رو رہ کے اشک بہتے تھے روئے جناب سے
شبنم ٹپک رہی تھی گل آفتاب سے

60۔ بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کے
کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کے

61۔ بچے کو دفن کرکے پکارا وہ ذی وقار
اے خاکِ پاکِ حرمت مہمان نگاہ دار

62- آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

63- سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے

64- گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

65- اُس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ امم
نہ دامنِ رسولؐ تھا نہ سایۂ علم

66- چاہوں جو انقلاب تو دنیا تمام ہو
الٹے زمین یوں کہ نہ کوفہ نہ شام ہو

67- قرآن رحلِ زیں سے سرِ فرش گر پڑا
دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

68- جنگل سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداؐ

69- ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
مُنہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن اِدھر اُدھر

70۔ یوں تھے خدنگ ظلِ الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر

71۔ اب چھوڑیو نہ دشتِ بلا میں حسینؑ کو
یا فاطمہؑ چھپا لو ردا میں حسینؑ کو

72۔ بس اے انیسؔ ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند

نورتن

ان بہتر (72) جواہر کے نورتن یہ ہیں ۔

1۔ شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

2۔ خواہاں تھے زہر گلشن زہراؑ جواب کے
شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

3۔ سارا چلن خرام میں کبک دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دلہن کا ہے چہرہ پری کا ہے

4۔ گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

5۔ پانی تھا آگ گرمئی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

6۔ ظاہر نشانِ اسم عزیمت اثر ہوئے

جن پہ علیؑ لکھا تھا وہی پر سپر ہوئے

7۔ ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑ گڑائے
غصہ میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کڑ کڑائے

8۔ قرآن رحلِ زیں سے سرِ فرش گر پڑا
دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

9۔ جنگل سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداً

شعر

حاصلِ مرثیہ

جنگل سے آئی فاطمہؑ زہرا کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمدا

دسواں باب

معجز بیانی

میر انیسؔ ایک عظیم شاعر تھے اس لئے ان کی شاعری بھی عظیم ہے۔ اُن میں شاعری میں کمال حاصل کرنے کی تمام قوتیں بدرجہ احسن موجود تھیں۔ بقول حالیؔ ان قوتوں میں ایک وہبی ہے جس کا نام تخیل ہے اور دوسری دو قوتیں جو کسبی ہیں مطالعہ فطرت اور الفاظ پر قدرت ہے۔ قوت تخیل وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ قوت جتنی اعلیٰ درجہ کی ہوگی اُسی قدر شاعری بھی اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ اسی قوت متخیلہ کے ذریعۂ ایک شاعر کچھ الفاظ میں ایسے خیال کو سمیٹ دیتا ہے جو کئی جلد کتابوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ ذہن میں جو تجربات اور معلومات کا ذخیرہ پہلے سے مہیا ہوتا ہے اُس کو یہ قوت اچھوتی ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور یہ پھر اس کو الفاظ کے ایسے دل کش پیرائے میں ظاہر کرتی ہے تو شعر بنتا ہے۔ قوت تخیل ہر شخص میں یکساں نہیں ہوتی اور جس شخص میں ہوتی وہ ہمہ وقت یکساں نہیں رہتی بلکہ اس کا اثر کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

نہیں ممکن کہ کلک فکر لکھے شعر سب اچھے
برستا ہے بہت نیساں گہر ہوتے ہیں کم پیدا

اگر یہ قوت تخیل غضب کی ہو اور پھر مشاہدہ اور تجربہ جو باریک بینی علم اور مطالعہ سے زیادہ ہو تو وہ شخص بڑا شاعر ہوتا ہے۔ یہی چیز میر انیسؔ کے کلام میں موجود تھی۔ چنانچہ جیسے ہی اچھوتا طائر خیال فضائے ذہن میں ظاہر ہوتا۔ میر صاحب کی قوت متخیلہ اسے الفاظ کا پیکر دے کر گلشن سخن میں اتار دیتی تھی۔

مثال کے طور پر درختوں کے تنوں کے اطراف جو پھول گرے ہوتے ہیں یا گلاب کے پھولوں پر جو شبنم کے قطرے پڑے ہوتے ہیں یا درختوں کے پتوں پر جو اوس کے قطروں کی چمک سورج کی شعاع سے پیدا ہوتی ہے اُس کو کس خوب صورتی سے نظم کیا جو بیان سے باہر ہے۔

پھولوں سے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے   تھالے بھی نخل کے سبدگل فروش تھے

خواہاں تھے زہرِ گلشنِ زہرا جو آب کے　　　شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے　　　پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

شاعری میں کمال کی دوسری کسبی قوت مطالعہ کائنات ہے۔یعنی شاعر جتنا دقیق اور باریک بینی سے مناظر قدرت اور فطرت انسانی کا مطالعہ کرے گا وہ ذہن میں ذخیرہ کی صورت میں حواس خمسہ کے دروازوں سے جمع ہوگا اور اسی مسالہ کو لے کر اس کی قوت متخیلہ دنیائے سخن میں کہیں سنگ مرمر کا تاج محل تو کہیں لال پتھر کا لال قلعہ تو کہیں مٹی کے تودوں سے بی بی کا مقبرہ تعمیر کرتی ہے۔

اس مرثیے میں جہاں جن ،انس ، چرند، پرند، نباتات ، جمادات غرض کائنات کی ہر چیز کو میر انیس خدا کی تسبیح اور حمد میں مصروف بتاتے ہیں وہاں ان کی باریک بینی چیونٹی کی حرکت کو بھی دقیق نظر سے دیکھتی ہے جب وہ اپنے سامنے کے پیر میں دانہ لے جاتے وقت زمین پر نہیں ٹکتی ۔بس ادھر ذہن میں یہ طائر خیال پرواز کیا اُدھر اُسے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر یوں ظاہر کیا ؎

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار　　　"اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار"

عاشور کی نماز صبح میں امام اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی تصویر کشی ملاحظہ کیجیے ؎

قرآن کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز　　　بسم اللہ آگے جیسے ہو، یوں تھے شہ حجاز

نمازیوں کے رکوع، سجود اور قنوت کو کن کن تشبیہات سے آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں۔

سجدوں میں چاند تھے، مہ نو تھے رکوع میں

شہ پر تھے دونوں ہاتھ لئے طائر دعا　　　ہاتھ اُن کے جب قنوت میں اٹھے سوے خدا

شاعری میں کمال حاصل کرنے کی تیسری قوت شعر کی ترتیب کے وقت مناسب الفاظ کا استعمال ہے۔میر انیس مترادف الفاظ کے باریک سے باریک فرق سے بھی واقف تھے۔وہ معمولی شاعروں کی طرح ہر لفظ پر قناعت نہیں کرتے بلکہ مترادف لفظوں پر جب تک دقیق نظر نہ ڈالتے کسی لفظ کا انتخاب نہیں کرتے تھے،اسی لئے وہ لفظ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح بیٹھتا۔میر انیس کا سینہ لفظوں کا گنج اور معانی کا سر چشمہ تھا۔ہم الفاظ اور ان کے استعمال پر پہلے بحث کر چکے ہیں اس لئے یہاں تکرار ضروری نہیں سمجھے۔

اعلی تخیل، وسیع مطالعہ فطرت اور الفاظ پر کامل اختیار نے میر انیس کے کلام کو معجز نما بنا دیا۔اگر ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری مراثی انیس کا گہرا مطالعہ کرتے تو ہندوستان کی الہامی کتابوں کو دو کے بجائے تین لکھتے۔یعنی وید مقدس۔

دیوان غالب اور مراثی میر انیس۔ ابوالکلام آزاد نے صحیح لکھا تھا۔ دنیائے ادب کو اُردو ادب کی جانب سے غالب کی غزلیں اور انیس کے مرثیے تحفہ سمجھنے چاہیں۔ اگر چہ اُردو عربی اور فارسی زبان کے مقابلے میں کمزور، محدود اور کم عمر زبان ہے لیکن میر انیس نے اپنے تخیل کی بلندیوں سے اس محدود زبان میں وہ وسعت پیدا کر دی کہ اُردو مرثیہ فارسی اور عربی مرثیوں سے بہت آگے بڑھ گیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اگر میر انیس فارسی میں مرثیہ کہتے تو کس منزلت پر ہوتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ افسوس جو دل میں ہوتا ہے وہ پورے طور پر قلم سے ادا نہیں ہوتا۔ جیسا کہنا چاہتا ہوں ویسا نہیں ہوتا۔ میر حامد علی کہتے ہیں آپ کا کلام اس پائے کا تو ہوتا ہے اب اس سے بہتر اور کیا ہو؟ مگر میر انیس پھر فرماتے تھے کہ اس کو میرا دل ہی جانتا ہے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ ٹھیک طور پر ادا نہیں ہوتا۔

اس تمہید کے ساتھ ہم اس مرثیہ میں منظر نگاری، واقعہ نگاری، مرقع نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، رزم نگاری، ڈراما نگاری، نفسیات نگاری، جدت نگاری، تمثیل نگاری، تسلسل اور ہم آہنگی، حفظ مراتب، اعلیٰ انسانی اقدار، سماجی عناصر اور المیہ مضامین کی اہمیت اور عظمت کو اشعار سے ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

منظر نگاری۔ حکیم ارسطو نے اپنی تالیف بوطیقا (Poetics) میں شاعری کا مقصد اور اس کا ماحصل ''نقالی'' یا Imitation بتایا ہے۔ یعنی وہ واقعات، مناظر اور کیفیات جن کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے اُس کی ہو بہو تصویر کشی کی جائے۔ چنانچہ منظر کشی بھی اسی تصویر کاری کا ایک جزو ہے جسے مقبولیت اس لئے زیادہ حاصل ہوئی کہ منظر کشی کے نظارے ذہن پر جذبات اور واقعات کی تصویروں کی نسبت جلد نقش ہو جاتے ہیں۔

مناظر قدرت کی مصوری میں یورپ کے شاعروں خاص طور پر ورڈسورتھ کے بعد شاعروں نے جس شگفتگی اور دل کشی سے کام لیا اس کی بہترین مثال اُردو ادب میں صرف میر انیس کے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔ انیس نے اپنے مشاہدہ سے ان مناظر کی جو منظر کشی کی ہے ان کے نقش آج بھی تر و تازہ ہیں۔ وقت کے سیلاب سے یہ تصاویر دھندلی نہ ہو سکیں کیوں کہ انیس اپنے موقلم سے صرف اُن الفاظ کو استعمال کر رہے تھے جن کے رنگ لعل و یاقوت و زمرد کی طرح ذاتی تھے۔

لفظوں میں یوں ہے معنیٔ روشن کی آب و تاب
جس طرح عکس آئینہ میں جام میں گلاب

انیس کی منظر کشی کی تصویریں اس لئے زندہ معلوم ہوتی ہیں کہ وہ اُن میں سہ بُعدی (Three Dimensional) یعنی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کا تصور پیدا کرتے ہیں اور پھر ان سہ بعدی تصاویر میں اپنی

صنعت کاری اور معجز کلامی سے حرکت پیدا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے تراشے ہوئے پیکر قاری یا سامع کے ذہن میں مدتوں محو نہیں ہوتے۔ اس مرثیہ کے اٹھارہ بندوں میں روز عاشورہ نماز صبح کو بڑے ہی دلکش انداز اور بڑی ہی تفصیل سے پیش کیا گیا۔ اذان سے لے کر سلام و درود، مناجات و دعا اور نماز کے اختتام پر نمازیوں کے مصافحہ تک کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ ہر پڑھنے اور سننے والے کو ایسا احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ بھی اس نماز میں شامل ہے۔ ان اٹھارہ بندوں میں نماز جماعت کے تمام جزئیات کو نظم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے نماز کے تمام ارکان کے نام ہی نہیں بلکہ ان کی مناسبت سے دلکش اور اچھوتے مضامین بھی بڑے پُر تاثیر طور پر بیان ہوئے۔

روز عاشورا پانی موجود نہ تھا اس لئے نمازیوں نے تیمم کیا۔ نورانی چہرے جو خاک کی لپیٹ میں آئے تو فرماتے ہیں

قاسم سا گل بدن علی اکبر سا خوش جمال اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال
سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

جن لوگوں نے مرثیوں کا مطالعہ نہیں کیا وہ اُردو شاعری میں منظر کشی کو یورپ کے فن کاروں کے مقابلے میں ہیچ جانتے ہیں۔ وہ متوسطین اور متاخرین کی مثنویات اور موجودہ دور کی نظموں کو منظر نگاری کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ یقیناً اگر مثنویات اور موجود نظموں کو یورپ کے شاہکاروں سے مقابلے میں پیش کریں تو ان کی منظر کشی کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔ لیکن اگر مرثیوں میں موجود منظر کشی کی اُردو ادب جلوہ نمائی کرے تو یہ دنیائے ادب کے آسمان سخن پر آفتاب بن کر نمودار ہوگی۔ صبح کا منظر ایک دلکش اور دل فریب منظر ہے ادبیات دنیا کے بعض عظیم شاعروں نے اس کو نظم کیا ہے۔ اُردو شاعری کا دامن بھی اس سے خالی نہیں لیکن جس طرح میر انیسؔ نے صبح کی منظر کشی کی ہے کوئی اور شاعر ان کے مقابل میں نظر نہیں آتا۔ نمونے کے طور پر صبح کی منظر کشی میں چند مصرعوں کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
وہ جا بہ جا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم　　　کوکو "کا شور" نالۂ حق سرہٗ" کی دھوم

انیسؔ منظر نگاری کے دوران سننے اور پڑھنے والے کو ایک منظر کے اندر ہی دوسرے منظر کے نظارے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں اور یہ عمل اس خوبصورتی سے ہوتا ہے کہ کے ذہن کے کینوس پر پہلا عکس کچھ دھندلا سا ہو جاتا ہے اور دوسرا نظارہ آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اس مرثیہ میں جہاں انیسؔ صبح کی نیچرل عکاسی کر رہے ہیں وہیں پر ایک ایسی نماز جماعت کی مرقع کشی بھی کر رہے ہیں جو تاریخ اسلام کی عظیم جماعت کی نماز ہے۔ انیسؔ کو پہلے اس جماعت کے سردار کا مقام اور اس کی عظمت اور اس کے افراد کا تعارف کچھ اس طرح کرنا ہے کہ یہ برگذیدہ ہستیاں فرشتہ صفات کی حامل رہتی ہوئی بھی انسانی کردار اور اخلاق کی وہ بلند مرتبہ شخصیتیں باقی رہیں جو دوسرے انسانوں کیلئے قابل تقلید بن سکیں۔ امام حسینؑ کے خیمے کی عظمت ملاحظہ فرمائے۔

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگارگوں کی شان　　　گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسمان

بے چوبۂ سپہر بریں جس کا سائبان　　　بیت العتیق دیں کا مدینہ جہاں کی جان

اللہ کے حبیبؐ کے پیارے اسی میں تھے

سب عرش کبریا کے ستارے اِسی میں تھے

گردوں پہ ناز کرتی تھی اُس دشت کی زمیں　　　کہتا تھا" آسمانِ دہم" چرخ ہفتمیں

میر انیسؔ نے دو بندوں میں خیمۂ امام حسینؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے اس نیلے رنگ کے خیمے کو زمین پر آسمان،۔ بیت العتیق، دنیا کی جان، مرکز دین اور آسمان دہم کہا ہے جس میں اہلبیت رسولؐ مقیم تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فلک کے تمام تارے اور عرش کبریا کے تمام ستارے اس میں جمع ہو گئے ہیں۔

اعلیٰ ترین منظر کشی کے ساتھ اگر ادائیگی بھی عالی ہو تو اُس کا اثر دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ شادؔ عظیم آبادی کہتے ہیں "جب میر صاحب نے "وہ دشت" کو سریلی اور بلند آواز میں کھینچا تو وسعت دشت آنکھوں میں پھر گئی۔ میر انیس کی جو بات تھی کلیجہ کے اندر اتری چلی جاتی تھی"۔

منظر کشی کے دوران بھی انیسؔ نفس مرثیہ سے ایک لحظہ کے لئے غافل نہیں ہوتے کیونکہ ان کے شعر کے مطابق۔

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو　　　دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

چنانچہ جہاں صبح کی منظر کشی میں تہلیل اور تسبیح کے ساتھ ساتھ پرند اور چرند کو مست دکھاتے ہیں وہیں ایک مصرعہ پر تشبیب کر کے اہلبیت رسولؐ کی مصیبت اور دشمنوں کے ہاتھوں اس چمن محمدی کی بربادی کا ذکر کرتے ہیں۔

"یا حی یا قدیر" کی تھی ہر طرف پکار   تہلیل تھی کہیں، کہیں تسبیح کردگار
طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں   جنگل کے شیر ہونک رہے تھے کچھار میں

تشبیب منظر کشی میں دیکھئے ۔

کانٹوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبیؐ کے پھول
خوش بو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار   پھولے سماتے تھے نہ محمدؐ کے گل عذار
ماہِ عزا کے عشرۂ اول میں لٹ گیا   وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

پھر انیس تفصیل کے ساتھ نماز جماعت کی مرقع کشی کرتے ہیں جس کو ہم "تسلسل اور ہم آہنگی" کے عنوان کے تحت بیان کریں گے ۔نواب امداد امام اثر "انیس کی شاعری" میں لکھتے ہیں۔

طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر ہونک رہے تھے کچھار میں

اس شعر کی نسبت میرا گمان ہے کہ شاید میر صاحب خود اس شعر کی تمام خوبیوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔اس شعر سے وہی شخص حسب مراد متلذذ ہوسکتا ہے جو علم حیوانات سے باخبر ہے۔ماننا چاہیے کہ صبح کے وقت طیور کو ہوا کے ساتھ محویت رہتی ہے۔یہ محویت طیور کو ہوا کے ساتھ دوپہر اور شام کو نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ طیور قبل اس کے وہ تلاش رزق میں اُڑیں اپنے بازوؤں کو پرواز کے قابل بنالیتے ہیں۔دوسرے ہرن کو سبزہ زار کے ساتھ محویت ہوتی ہے وہ بیشتر سبزہ زار ہی میں رہتی ہے۔اس قسم کے ہرن شب میں چری نہیں کرتی اور چری کے عوض رات بھر جگالی کرتی ہیں۔پس صبح ہوتے ہی چری میں مشغول ہوجاتی ہیں چونکہ صبح کو ان کو بھوک شدت کے ساتھ پیدا ہوجاتی ہے اور بھوک ان کو سبزہ زار کے ساتھ محویت پیدا کردیتی ہے۔مصرع دوم میں "جنگل کے شیر" کی قید لگا دی۔جاننا چاہئے کہ شیر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک کا مسکن پہاڑ ہوتا ہے اور دوسرے کا جنگل۔عادات اور خواص میں یہ دونوں شیر موافقت نہیں رکھتے۔پہاڑی شیر رات بھر تلاش رزق میں۔ادھر اُدھر پھر کر صبح کو پہاڑ کے کسی غار میں جو اس کا مسکن ہوتا ہے جا چھپتا ہے اور شام تک سورہتا ہے۔یہ شیر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا مگر جو جنگل کا شیر ہوتا ہے وہ دن کچھار ہی میں بسر کرتا ہے اور صبح کو ہونکا کرتا ہے۔

اس مرثیہ میں منظر کشی کا کمال یہ بھی ہے کہ عاشورا کی دوپہر جب حسینی فوج کا خاتمہ ہوگیا اور حسینؑ یکہ وتنہا رہ

گئے تو شاعر نے ناگہاں گرمی کا بیان شروع کیا اور بڑی تفصیل سے تشبیہات استعارات، تمثیلات، محاورات، صنائع معنوی اور صنائع لفظی اور کئی ایسی صنعتیں جن کے ابھی تک نام نہیں فائدہ اٹھاتے ہوئے آٹھ بندوں میں گرمی کی وہ منظر کشی کی کہ اُردو ادب میں اس کی مثال ملنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے۔ یہاں گرمی کے موضوع کو بیان کرتے ہوئے گرمی سے مربوط تقریباً تمام نکات اور لوازمات کو ایسا بیان کیا ہے کہ اس میں مزید اضافہ کا امکان نظر نہیں آتا۔ زبان کا شمع کی طرح جلنا، لوں اور حرارت کے الاماں، آبِ خنک کو خلق کا ترسنا، ہوا سے آگ برسنا، آفتاب کی حدت، تب وتاب کی شدت، دھوپ کا کالا رنگ، نہر کے لبوں کا سوکھنا، حبابوں کا تپنا، فرات کے پانی کا کھولنا، سمندر کا مچھلیوں کے ساتھ رہنا، پتھروں کا پگھلنا، پھولوں اور سبزیوں سے رنگوں کا اُڑنا، سایا کا کنویں میں اُترنا، نخلِ چنار کا جلنا، شاخوں کا کانٹا ہونا۔ پتوں کا زرد ہونا، مردم کا عرق میں تر ہونا، نگاہ کے پاؤں میں آبلے پڑنا، زمین کو بخار آنا، دانوں کا بھن جانا، جوالہ، انگارے، شرر کے ساتھ پانی کا آگ، موج کا تیغ اور ماہی کا کباب ہو جانا، برق کا بادلوں میں چھپنا، نہنگوں کا سمندر کی تہوں میں رہنا، چرخِ اثیر میں آگ کا بھڑکنا اور کرہ زمہریر میں بادلوں کا چھپنا اپنی آپ مثال ہے۔

چونکہ یہ منظر کشی معجز بیانی ہے اس لئے تمام آٹھ بند یہاں پیش کیے جاتے ہیں ۔

گرمی کا روز جنگ کی کیوں کر کروں بیاں　　ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں　　رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لوں، وہ آفتاب کی حدت، وہ تاب وتب　　کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب　　خیمے جو تھے حبابوں کے، تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے چارپائے نہ اُٹھتے تھے تا بہ شام　　مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے، تو چیتے سیاہ فام　　پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثلِ مومِ خام
سرخی اڑی تھی پھولوں سے، سبزی گیاہ سے

پانی کنوؤں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے، نہ برگ و بار — ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل، نہ لہکتا تھا سبزہ زار — کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخ باروار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں!

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا، جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں — انگارے تھے حباب، تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہ میں تھے سب نہنگ، مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی، کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب — چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب — کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

یہاں گرمی کا بیان مبالغہ تک پہنچ کر بھی سننے اور پڑھنے والے کے لئے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ مبالغہ خود فنِ شعر میں صنعت مانا جاتا ہے۔ ان آٹھ بندوں میں دو عالم کی گرمی کو بیان کر کے تمام گرمی کو صرف ایک مصرعہ سے تشبیہ

کر کے امامِ مظلوم کے سر پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ہے میر انیسؔ کا فن۔ میر انیسؔ کی دعا درگاہِ رب العزت میں مستجاب ہوئی۔ ع نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یا رب

اُس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ اُمم (۱۰۳) نہ دامنِ رسولؐ تھا، نہ سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دم بہ دم اودے تھے لب، زبان میں کانٹے، کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

دقیق نیچر کا مطالعہ منظر کشی کی جان ہے۔ مچھلیوں کی جلد کو کس نے نہیں دیکھا؟ پانی میں سانس لیتی ہوئی مچھلیوں کے منہ کو کسی نے نہیں دیکھا؟ نہنگ سمندروں کی گہرائیوں میں ہوتے کس نے نہیں سُنا۔ موج گرداب، بہتا دریا اور پانی پر بلبلوں کو ہر شخص دیکھتا ہے لیکن جب میر انیسؔ نے اسے دیکھا تو دوسرے ہی رنگ میں دیکھا چنانچہ ان مشاہدات کو حسنِ تعلیل کے زیور سے آراستہ کر کے پیش کیا تو وہ کلام کا حسن اور تجلیل بن گئے۔

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر منہ کھولے چھتی پھرتی تھیں لیکن ادھر اُدھر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر تھے تہ نشیں نہنگ مگر آب تھے جگر
دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

بعض تنقید نگاروں نے میر انیسؔ کی اس مبالغہ آرائی پر اعتراض کیا ہے لیکن بزرگ علمائے ادب جن میں شبلی، نظم طباطبائی، مسعود حسن ادیبؔ، ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری اور احتشام حسین شامل ہیں وہ تخیل کے کذب کو روا رکھتے ہیں اور نظامیؔ کے اس شعر سے استدلال کرتے ہیں۔

در شعر مپیچ و در فنِ او زاں اکذب اوست احسن او

اگر شعری تخیل بالکل سچائی کے مطابق اور مماثل ہو جائے تو پھر شعریت باقی نہیں رہتی۔

دندانِ تو جملہ در ہانند چشمانِ تو زیرِ ابروانند

نظم طباطبائیؔ کہتے ہیں ''شعر کو خلاف واقعہ سمجھنا خدا گواہ ہے کوتاہ نظری ہے'' حقیقت یہ ہے کہ میر انیسؔ کو مورخ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فطری عظیم شاعر کی طرح دیکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری اپنے ایک مضمون "مرثیہ بحظ انیس" (مطبوعہ طلوع افکار کراچی بابت جون 1998ء) میں لکھتے ہیں کہ

"انیس اردو کے عظیم رزم نگار (Epic Poet) ہیں اور اس فن میں یکتا و تنہا تھے۔ وہ خالص شاعر تھے۔ شاعر اور مورخ میں فرق ہے۔ مورخ واقعات گذشتہ کو جو حقیقتاً وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کو مختصر ترین الفاظ اور اشاروں میں پیش کرتا ہے۔ برعکس اس کے ایک قادر الکلام شاعر بیک جنبش قلم قرین قیاس ناممکنات کو خلاف قیاس ممکنات پر ترجیح دیتا ہے۔ یعنی وہ مبالغہ آمیز واقعات کی اس ترتیب اور حسن سلیقہ سے منظر کشی کرتا ہے کہ قارئین کو یقین ہو جاتا ہے کہ ایسے واقعات ضرور رونما ہوئے ہوں گے، جب کہ اصلیت میں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے۔

بعض نگاہ غلط انداز ناقدین میر انیس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے مرثیوں میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ شاید وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ انیس اصل میں شاعر ہیں نہ کہ مورخ۔ مورخ مبالغہ آرائی سے گریز کرتا ہے۔ سچا مورخ وہی کہلاتا ہے جو کتب تواریخ میں غیر جانبدار ہو کر اصل واقعات کی نشاندہی کرتا ہے۔ فن تنقید نگاری کے بانی ارسطو نے شاعر (رزم نگار) کے لئے یہ لازم و ملزوم قرار دیا کہ وہ مبالغہ (The Etement of Wonderful) سے قارئین کو محظوظ کرے۔ وہ بوطیقا میں لکھتا ہیں کہ:-

" The Poet should prefer probable Impossibilites to improper possibilites"

انیس کے اکثر و بیشتر مرثیے رزمیہ (EPIC) اصولوں کے تحت آتے ہیں۔ انیس نے ماحول کے گرد و پیش حالات سے متاثر ہو کر مبالغہ کے لئے ایک نئی راہ نکالی اور بحیثیت شاعر اپنی قوت متخیلہ سے قارئین کی لطف اندوزی کے لئے ایسے واقعات بھی بیان کیے کہ جن کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لیکن پڑھنے والا ان کو درست سمجھتا ہے۔ ذیل میں انیس کے صنعت مبالغہ کی ایک خوبصورت مثال پیش کی جاتی ہے۔

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں   انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں   تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اس بند میں شاعر نے اس گرمی کی شدت کا اثر بیان کیا جو صحرائے کربلا میں روز عاشورا رونما ہوا تھا۔ اس کا حال

کتب تواریخ کے علاوہ احادیث میں بھی ملتا ہے۔یعنی بھوک، پیاس اور لشکر اعدا کے علاوہ امام عالی مقام کا مقابلہ دھوپ کی تپش کے ساتھ بھی تھا۔ہم نے ہندوستان کے کچھ گرم علاقے بھی دیکھے ہیں جہاں گرم ہوائیں چلتی ہیں اور پابرہنہ چلنے والوں کے چھالے پڑ جاتے ہیں۔شدت گرمی سے پانی کھولا ہوا محسوس ہوتا ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ اوپر کے بند کے بارے میں بھارت کے سابق چیف جسٹس اور نائب صدر جمہوریہ ہند جسٹس محمد ہدایت اللہ مرحوم نے ستمبر 1983ء میں کشمیر یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد (Convocation) کے موقعہ پر اپنے ایڈرس میں کشمیر اور ہندوستان کی آب و ہوا کے بارے میں انیس اور عرفی کا موازنہ کیا اور عرفی کا یہ شعر پیش کیا ہے

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید

گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

''یعنی اگر کوئی ''مرغ کباب'' وارد کشمیر ہو جائے تو اس کے نئے بال و پر نکل آئیں گے۔ برعکس اس کے ہندوستان میں ایسی گرمی پڑتی ہے کہ اگر مچھلی تہِ آب سے ابھرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ سیخ کا کباب بن جاتی ہے۔یہاں انیس نے موج کو انگاروں پر رکھے ہوئے سیخ کے ساتھ تشبیہ دے کر کمال فن کا اظہار کیا ہے''

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے صحیح کہا ہے کہ ''کتاب قدرت ایک تاریک کتاب ہے۔جس کے اوراق پر سوائے شعرا کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔اس ضیا میں ہر شئے ایک نئی تصنیف اور صورت میں مشاہدہ ہوتی ہے لیکن روشنی شعشۂ برق کی مثال دم زدن میں غائب ہو جاتی ہے اور پھر وہی ظلمت چھا جاتی ہے۔اس روشنی میں ہر رگ سنگ میں خون شہیداں اور ہر شرر سنگ میں جلوۂ یزداں نظر آتا ہے۔یہ کوئی شاعرانہ دروغ یا فریب نظر نہیں بلکہ مشاہدۂ حقیقت ہے۔جب شعرا گرد و پیش کے مناظر اور واقعات کو دور از کار اور فوق الفطرت طور پر بیان کرتے ہیں تو وہ بیان اُن کے عینی اور یقینی نظارے پر مبنی ہوتا ہے''

پروفیسر مسعود حسن ادیب لکھتے ہیں کہ ''انیس کی گرمی کی شدت کا بیان اس قدر طولانی اور اتنا مبالغہ آمیز کسی دوسری جگہ نہیں لکھا۔اس بیان میں جو مبالغہ کیا گیا ہے وہ جا بہ جا غلو کی حد تک پہنچ گیا ہے مگر باکمال شاعر نے مبالغہ کے ساتھ اصلیت کی آمیزش اس ہوشیاری کے ساتھ کر دی ہے اور دونوں کو اس طرح دوش بدوش لے چلا ہے کہ گرمی کی شدت کا حقیقی احساس قدم قدم پر ہوتا جاتا ہے۔اس کے علاوہ حسن بیان ندرت تشبیہات، جدتِ استعارات، حسن تعلیل وغیرہ اتنی خوبیاں اس بیان میں بھر دی ہیں کہ سامعین پر ایک حیرت سی طاری ہو جاتی ہے اور ان کو مبالغہ اور اصلیت میں امتیاز کرنے کا ہوش نہیں رہتا۔مبالغہ کلام کی صنعتوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس میں